پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ اُن کے بارے میں وثوق اور یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاثراتِ قلب خواہ کتنے ہی شدید ہوں، اتنے واضح اور قطعی نہیں ہوتے کہ ان کو کفر و ایمان کا مدار بنایا جا سکے۔

دراصل ہمارے ہاں صدیوں سے یہ غلط تصور چلا آ رہا ہے کہ الہام کشف ہی کی کوئی ترقی یافتہ شکل ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ عقلی تجربات، مراقبہ و تفکر اور وحی و الہام تین الگ الگ انواع ہیں اور ان تینوں کے میدان بالکل جدا جدا ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے پاس ایک ایسی باطنی طاقت اور اندرونی حاسہ ہے جس کو اگر وہ بیدار کرے اور ترقی دے تو مادیات سے ماوراء بہت سے عجائبات اور موجودات کا ادراک کر سکتا ہے جن کا ادراک کسی حاسۂ ظاہری سے ممکن نہیں لیکن یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک انسان کے ظاہری حواس کے ساتھ ایک حاسۂ باطنی بھی ہے اور ممکن ہے کہ دوسرے حاسے بھی ہوں۔ لیکن اس سے یہ اخذ کر لینا کہ یہ حاسہ بالکل صحیح ہے اور اس راستہ سے جو علم انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ بالکل درست اور قطعی ہے، ٹھیک نہیں۔ انسان کے دیگر حواس کی طرح یہ بھی ایک حاسہ ہے۔ اسی طرح کمزور اور محدود جس طرح دوسرے، اُسی طرح خطاپذیر اور متاثر ہونے والا جس طرح انسان کی ساری طاقتیں اور انکشافِ علم کے سارے ذرائع۔ اس وجہ سے جو علم ہمیں اس ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اس میں صحت اور قطعیت نہیں ہوتی۔ اور اس بنا پر اس پر کفر و ایمان کا انحصار نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر ہم اہلِ کشف کے باطنی تجربات کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑا تعارض اور تناقض پایا جاتا ہے جس کی نظیر شاید فلسفہ میں بھی نہ مل سکے۔

جو چیز کفر و ایمان کے لیے ایک کسوٹی کے طور پر انسانیت کو دی گئی ہے وہ نہ تو انسانی عقل کی رہینِ منت ہے اور نہ ہی اندرونی کیفیات کی کرشمہ سازی۔ وہ نہایت واضح طور پر ہر آلائش سے پاک اور منزہ، خارج سے بعض پاکباز انسانوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس میں نہ اُس شخص کی عقل کو دخل ہوتا ہے اور نہ ہی اُس کے باطنی تجربات کو۔ پھر یہ کسی محنت سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء گزرے ہیں انھوں نے اپنے دعوائے نبوت کو بڑے یقین اور وثوق سے پیش کیا۔ اس کے اقرار کو نجات، اور انکار کو کفر قرار دیا۔ اپنے بارے میں انھوں نے

کبھی کسی شک اور تذبذب کا اظہار نہ کیا۔ دعویٰ کرنے سے پہلے ان کے متعلق کبھی کسی کو یہ گمان تک نہ ہوا کہ وہ کوئی غیر معمولی دعویٰ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن جب اللہ نے پیغام نازل فرما دیا تو پھر بڑے وثوق اور یقین سے انھوں نے اپنے دعویٰ کو پیش کیا اور اپنے موقف کو لوگوں سے منوایا۔ اب جو شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ خارجی ماحول انسان کے اندر بعض ایسی داخلی کیفیات پیدا کرتا ہے، جن کے ذریعہ وہ اپنے خالق کی صورت گری کر سکتا ہے تو وہ سخت غلطی پر ہے، کیونکہ اس قسم کی واردات خواہ کتنی ہی روح پرور اور مسحورکن ہوں، ایک دین کی تخلیق نہیں کر سکتیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک فرد کی روحانی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں لیکن کسی انقلاب انگیز اور باطل شکن تحریک کو جنم نہیں دے سکتیں کیونکہ ان میں وہ قوت، وہ وثوق اور یقین نہیں ہوتا جو کسی نظامِ حیات کے لیے ضروری ہے۔ اس قسم کے کشف صرف ایک فرد تک محدود رہتے ہیں اور وہ کسی صورت میں بھی دوسروں کے لیے حجت نہیں بن سکتے۔ جب ایک چیز کو حجت، برہان یا الفرقان کے طور پر پیش کیا جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہایت واضح اور غیر مبہم ہو۔

کتاب کے اس حصے میں دو تین مقامات ایسے آتے ہیں جو اگر نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ فاضل مصنف نے جہاں جہاں عورتوں کی تصویر کشی کی ہے وہ ان جیسے سنجیدہ آدمی کے شایانِ شان معلوم نہیں ہوتی۔ انھوں نے الفاظ کے بالکل بے جا اسراف سے اس قسم کی تصاویر کھینچی ہیں جن میں لذتیت صاف طور پر جھلکتی ہے۔

رسائل و مسائل

حدیث اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ ...... کی علمی تحقیق

سوال:- میرے ایک دوست نے جو دینی شغف رکھتے ہیں، حال ہی میں شیعیت اختیار کر لی ہے، انہوں نے اہلِ سنت کے مسلک پر چند اعتراضات کیے ہیں جو درج ذیل ہیں۔ امید ہے آپ ان کے تشفی بخش جوابات دے کر ممنون فرمائیں گے۔

(۱) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا فَمَنْ اَرَادَ الْمَدِیْنَۃَ فَلْیَاْتِ الْبَابَ کا مفہوم کیا ہے؟

(۲) کیا اس حدیث سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ علم ــــ دینی علم ــــ کے حصول کا واحد اور سب سے معتبر ذریعہ صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذاتِ گرامی ہے اور اس کے سوا جن دوسرے ذرائع سے علمِ دین حاصل کیا گیا ہے، وہ ناقص ہیں اور اس وجہ سے ان کی دین کے اندر کوئی اہمیت نہیں؟

جواب:- احادیث سے استناد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے روایت کے اعتبار سے دیکھا جائے کہ وہ کہاں تک قابلِ اعتماد ذرائع سے مروی ہوئی ہیں، پھر ان کے معنی پر غور کیا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ بشرطِ صحت، ان کا صحیح مدعا کیا ہو سکتا ہے۔ کسی حدیث کا کوئی ایسا مفہوم لینا جو حضورؐ کے دوسرے بہت سے ارشادات سے ٹکراتا ہو، یا جس سے بہت سی قباحتیں لازم آتی ہوں، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ اس کے بجائے اُس کا اگر کوئی ایسا مفہوم ہو سکتا ہو جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے ارشادات سے مطابقت بھی رکھتا ہو اور ہر قباحت سے بھی خالی ہو، تو ایک ذی فہم آدمی کے لیے وہی قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

اس قاعدے کو نگاہ میں رکھ کر پہلے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ حدیث اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا

بلحاظِ روایت کیا مقام ہے۔ صحاح میں سے اس کو صرف ترمذیؒ نے لیا ہے اور اس میں انا مدینۃ العلم کے بجائے یہ الفاظ ہیں: (انا دار الحکمۃ وعلی بابھا (میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے)۔ راوی اس کے خود حضرت علیؓ ہیں۔ امام ترمذیؒ اس کو نقل کرنے کے بعد اس کی روایتی حیثیت پر جو تبصرہ کرتے ہیں وہ یہ ہے:

هٰذا حدیث غریب منکر۔ روی بعضھم هٰذا الحدیث عن شریك ولم یذکروا فیه عن الصُّنابِحِی۔ ولا نعرف هٰذا الحدیث عن احد من الثقات غیر شریك۔

یہ حدیث غریب اور منکر ہے۔ بعض راویوں نے اسے صرف شریک تابعی سے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں صُنابِحِی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ شریک کے سوا ثقات میں سے کسی نے بھی اس کو روایت کیا ہو۔

غریب، اصطلاحِ علمِ حدیث میں اس روایت کو کہتے ہیں جس کا مدارِ سند کے کسی مرحلے میں صرف ایک راوی پر رہ جائے۔ اور منکر اس روایت کو کہتے ہیں جو نری غریب ہی نہ ہو بلکہ اس کا راوی بھی ضعیف ہو۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سند کے لحاظ سے ترمذیؒ کی اس روایت کا پایہ کیا ہے، اور اس پر سارے دین کی بِنا رکھ دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔

ترمذی کے بعد اس مضمون کی روایات کا سارا دارومدار حاکم کی مستدرک پر رہ جاتا ہے جو بجائے خود ہی حدیث کی معتبر کتابوں میں شمار نہیں ہوتی۔ اس میں وہ ابنِ عباس اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے دو روایتیں مختلف الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔ ابنِ عباس والی روایت کے الفاظ ہیں انا مدینۃ العلم وعلی بابھا فمن اراد المدینۃ فلیأت الباب (میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے پس جو شخص شہر میں آنا چاہے وہ اس کے دروازے سے آئے)۔ اور جابر بن عبداللہ والی روایت میں آخری فقرہ یہ ہے: فمن اراد العلم فلیأت الباب۔ (جو علم حاصل کرنا چاہے اسے دروازے پر آنا چاہیے)۔ حاکم نے ان دونوں حدیثوں کے صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن علمِ حدیث کے بڑے بڑے ناقدین کی رائے میں نہ صرف یہ دونوں، بلکہ اس مضمون کی ساری روایات ساقط الاعتبار ہیں۔ ابن عباس والی روایت کے متعلق حافظ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ صحیح ہونا تو درکنار یہ تو موضوع ہے، اور جابر بن عبداللہ والی

روایت پر وہ یہ ریمارک دیتے ہیں:-

العجیب من الحاکم وجرأته فی تصحیحه هٰذا وامثاله من البواطیل، و احمد هٰذا دجّال کذّاب۔

حاکم پر سخت تعجب ہے کہ کس جرأت کے ساتھ وہ اس روایت اور ایسی ہی دوسری باطل روایتوں کو صحیح کہہ دیتا ہے۔ یہ احمد (یعنی احمد بن عبداللہ بن یزید الحرّانی جس کی سند سے یہ روایت حاکم نے نقل کی ہے) دجّال اور سخت جھوٹا ہے۔

یحییٰ بن معین اس حدیث کے متعلق کہتے ہیں کہ لا اصل لہٗ (اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے)۔ بخاریؒ کی رائے ہے کہ انّهٗ منکر ولیس لہٗ وجہ صحیح (یہ منکر روایت ہے اور اس کی نقل کا کوئی طریقہ بھی صحیح نہیں ہے)۔ نووی اور جزری اس کو موضوع کہتے ہیں۔ ابن دقیق العید کے نزدیک بھی یہ ثابت نہیں ہے۔ ابن جوزیؒ نے مفصل بحث کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ انا مدینۃ العلم والی روایت جتنے طریقوں سے بھی مروی ہوئی ہے سب کے سب موضوع ہیں۔

لائقِ غور بات یہ ہے کہ جس حدیث کا سند کے اعتبار سے یہ حال ہو اس پر اتنے بڑے فیصلے کی بنا رکھ دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے احکام صرف حضرت علیؓ کے واسطے سے حاصل کریں گے اور دوسرے صحابہ کو حصولِ علم کا ذریعہ سرے سے مانیں گے ہی نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں ہے۔ قرآن مجید کے بعد ہمارے لیے ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ اگر کوئی ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا اسوۂ حسنہ ہے، اور صحابہ کرام وہ ذریعہ ہیں جن کے واسطے سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ حضورؐ نے زندگی کے مختلف معاملات میں کیا رہنمائی فرمائی ہے۔ اب اگر ہم اس حدیث پر اعتماد کر کے اس علم کے لیے صرف ایک سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر انحصار کرلیں، تو لا محالہ ہمیں علم کے اُس بہت بڑے حصے سے محروم ہونا پڑے گا جو دوسرے صحابہ کے ذریعہ سے منقول ہوا ہے۔ کیا عقل یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے حضورؐ کا ارشاد ہم کو اس حدیث کی بہ نسبت بہت زیادہ قوی اور مستند و معتبر ذریعہ سے پہنچنا چاہیے تھا؛ بلکہ اسے تو بہت سی صحیح اور

مضبوط سندوں سے مروی ہونا چاہیے تھا، یہاں تک کہ اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

اب دیکھیے کہ اگر اس حدیث کا وہی مفہوم لیا جائے جو اس کے ظاہر الفاظ سے مترشح ہوتا ہے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بکثرت ارشادات سے، اور آپ کے زندگی بھر کے عمل سے کس طرح ٹکراتا ہے۔ حضور نے بہت سے صحابہ کو اپنی حیاتِ طیبہ میں فوج کا افسر بنا کر مہمات پر بھیجا۔ مملکتِ اسلامیہ کے مختلف علاقوں پر عامل مقرر کیا۔ تحصیلِ صدقات کے منصب پر مامور کیا۔ نماز پڑھانے کی خدمت سپرد کی۔ تعلیم اور تبلیغ کے لیے اطراف و نواحی میں روانہ فرمایا۔ یہ تاریخی حقائق ہیں جن سے انکار کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب خدمات کیا علمِ دین کے بغیر ہی انجام دی جاتی تھیں؟ یا یہ سارے صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے شاگرد تھے؟ اگر یہ دونوں باتیں غلط ہیں تو پھر صحیح بات صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ان صحابہ نے "مدینۃ العلم" یا "دار الحکمۃ" سے براہِ راست علم و حکمت کی تعلیم حاصل کی تھی اور یہ سب بھی حضرت علیؓ کی طرح شہرِ علم اور دارِ حکمت کے دروازے تھے۔

پھر جس شخص نے بھی سیرتِ پاک کا کبھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد سے حیاتِ دنیوی کی آخری ساعت تک حضورؐ براہِ راست خود دین کی تعلیم و تبلیغ فرماتے رہے، اور جو لوگ بھی دین کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتے تھے وہ بلا واسطہ حضورؐ ہی سے پوچھتے اور جواب حاصل کرتے رہے۔ کیا کبھی ایسا ہوا کہ حضورؐ کو خدا کی طرف سے جو احکام پہنچے ہوں وہ آپ نے صرف حضرت علیؓ کو بتائے ہوں اور دنیا تک انھیں پہنچانے کی خدمت تنہا حضرت علیؓ نے انجام دی ہو؟ یا کوئی شخص حضورؐ سے دین کی کوئی بات پوچھنے کے لیے حاضر ہوا ہو اور آپ نے فرمایا ہو کہ علیؓ سے جا کر پوچھو، یا علیؓ کے توسط سے میرے پاس آؤ؟ اگر نبوت کی ۲۳ سالہ زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تو آخر اس قول کا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ مدینۃ العلم کا صرف ایک دروازہ ہے اور وہ حضرت علی ہیں؟

خود حاکم جنہوں نے اس حدیث کو بڑے زور سے صحیح قرار دیا ہے، اپنی مستدرک میں ہزاروں حدیثیں دوسرے صحابہ سے نقل کرتے ہیں، اور ان میں بکثرت احادیث ایسی ہیں جن کی ہم معنی کوئی حدیث حضرت علیؓ سے ان کی کتاب میں منقول نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر حاکم کے نزدیک یہ حدیث صحیح تھی

اور مدینۃ العلم تک پہنچنے کا دروازہ صرف ایک ہی تھا تو یہ دوسرے بہت سے دروازے کہاں سے پیدا ہو گئے اور وہ کیوں اُن پر گئے ؟

حضرت علیؓ کا اپنا دعویٰ بھی یہ نہیں تھا کہ انھیں حضورؐ نے کوئی ایسا علم دیا تھا جو دوسروں کو نہ دیا ہو۔ بخاریؒ، مسلم اور مُسنَد احمد میں صحیح سندوں کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ حضرت علیؓ نے بار بار برسرِعام اُن لوگوں کے خیال کی تردید فرمائی تھی جو ایسا سمجھتے تھے۔ آپ نے اپنی تلوار کے پرتلے سے ایک کاغذ کا پُرزہ نکال کر لوگوں کو دکھا دیا تھا کہ اس کے سوا کوئی خاص چیز ایسی نہیں ہے جو میں نے حضورؐ سے سُن کر ثبت کی ہو، اور اُس پُرزے میں صرف چار پانچ فقہی احکام تھے۔ مُسنَد احمد میں ۱۳ مختلف سندوں سے حضرت علیؓ کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے۔ ان سب روایتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ممدوح نے متعدد مواقع پر عوام کی اِس غلط فہمی کو خود رفع فرمایا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے داماد کو رازمیں دین کے کچھ ایسے اسرار تعلیم فرما گئے ہیں جو دوسروں کو آپ نے نہیں بتائے۔ بہت سے لوگوں نے آنجناب کی اپنی زبان سے اس باطل خیال کی تردید سُنی اور یہ تردید اتنی مختلف سندوں سے محدثین کو پہنچی کہ اس کی صحت میں مشکل ہی سے شک کیا جا سکتا ہے[1]۔

اس کے بعد جب ہم اُن بہت سی صحیح احادیث کو دیکھتے ہیں جو دوسرے صحابہ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ حدیث اُن سب کے خلاف ہے۔ مُسنَد احمد اور ترمذی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے زید بن ثابت کے متعلق فرمایا افرضھم، یعنی صحابہ میں علم میراث کے وہ سب سے بڑے ماہر ہیں۔ معاذ بن جبل کے متعلق فرمایا اعلمھم بالحلال والحرام، "حلال و حرام کو وہ سب سے زیادہ جانتے ہیں"۔ اُبَیّ بن کعب کے متعلق فرمایا اَقْرَؤُھُم، "قرآن کے سب سے بڑے قاری وہ ہیں"

مُسنَد احمد میں خود حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لو کنت مؤمرًا احدًا من امتی من غیر مشورۃ لامرت علیھم ابن ام عبد "اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو بلا مشورہ امیر بنانے والا ہوتا تو ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کو بناتا"۔

ترمذی میں حضرت حُذیفہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا لا ادری ما بقائی فیکم فاقتدوا

[1] ملاحظہ ہو مسند احمد (مطبوعہ دارالمعارف مصر) احادیث نمبر ۵۹۹-۷۱۵-۷۸۲-۷۹۸-۸۵۸-۸۷۴-۹۵۴-۹۵۹-۹۶۲-۹۹۳-۹۹۷-۱۰۳۷-۱۲۹۷-۱۳۰۶

باللذین من بعدی ابوبکر وعمر - میں نہیں جانتا کہ میں کب تک تمہارے درمیان رہوں گا تم میرے بعد ان دو آدمیوں کی پیروی کرنا، ابوبکر اور عمرؓ" حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا مامن نبی الا ولہ وزیران من اھل السماء و وزیران من اھل الارض، فاما وزیرای من اھل السماء فجبریل ومیکائیل واما وزیرای من اھل الارض فابوبکر وعمر" ہر نبی کے لیے دو وزیر آسمان والوں میں سے اور دو وزیر زمین والوں میں سے ہوتے ہیں۔ میرے آسمانی وزیر جبریل و میکائیل ہیں اور زمینی وزیر ابوبکرؓ اور عمرؓ"

ترمذی ہی میں عقبہ بن عامر کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا لوکان بعدی نبی لکان عمر" اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا" بخاری و مسلم میں حضرت سعد بن وقاص روایت کرتے ہیں کہ سرکار نے حضرت عمر کو خطاب کر کے فرمایا یا ابن الخطاب والذی نفسی بیدہ مالقیک الشیطان سالکاً فجاً قط الا سلک فجاً غیر فجک" خطاب کے بیٹے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، جس راستے پر بھی شیطان کی تجھ سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، اس کو چھوڑ کر وہ کسی ایسے راستے پر چلا جاتا ہے جہاں تو اس کے سامنے نہ ہو" ابوداؤد میں حضرت ابوذر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں کہ ان اللہ وضع الحق علی لسان عمر یقول بہ" اللہ نے حق عمر کی زبان پر رکھ دیا ہے، اسی کے مطابق وہ بات کرتا ہے" بخاری و مسلم میں ابو سعید خدری بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضورؐ نے فرمایا رات میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگ میرے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں اور وہ چھوٹے بڑے کرتے پہنے ہوئے ہیں کسی کا کرتا سینے تک ہے، کسی کا زیادہ نیچے تک۔ اور عمر میرے سامنے پیش کیے گئے تو ان کا کرتا زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ حاضرین نے پوچھا کہ پھر حضور نے اس کی کیا تاویل فرمائی؟ ارشاد ہوا کہ کرتے سے مراد دین ہے"

یہ روایات تو دوسرے صحابہ کی ہیں۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو نہایت صحیح اور معتبر روایتیں کتب حدیث میں وارد ہوئی ہیں وہ ملاحظہ ہوں۔ بخاری میں حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد سے پوچھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر کون ہے؟ فرمایا ابوبکرؓ۔ میں نے عرض کیا پھر کون؟ فرمایا عمرؓ۔ اس کے بعد مجھے اندیشہ ہوا کہ میں پھر یہی سوال کروں گا تو یہ کہہ دیں گے

عثمانؓ۔ اس لیے میں نے پوچھا اُن کے بعد کیا آپ ہیں؟ فرمایا ما انا الا رجل من المسلمین "میں کچھ نہیں ہوں مگر بس مسلمانوں میں سے ایک آدمی"۔ یہ جواب ٹھیک اُس بلند اور پاکیزہ سیرت کے مطابق ہے جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تھی۔ اُن جیسے عالی ظرف انسان کا یہی مقام تھا کہ اپنے مرتبے کی فضیلت بیان کرنے سے اجتناب فرماتے اور اپنی ذات کو عام مسلمانوں کی صف ہی میں رکھتے۔

مُسندِ احمد میں امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی روایت ہے (اور یہ روایت ترمذی اور ابن ماجہ میں بھی ہے) کہ ان کے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کنت عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاقبل ابوبکر وعمر فقال یا علی ھٰذان سیدا کھول اھل الجنۃ وشبابھا بعد النبیین والمرسلین "میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا، اتنے میں ابوبکرؓ و عمرؓ سامنے سے آتے نظر آئے۔ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا اے علیؓ یہ دونوں پیغمبروں کے بعد تمام سن رسیدہ اور جوان اہلِ جنت کے سردار ہیں۔" (مسند احمد، حدیث نمبر ۶۰۲)۔

ایک اور حدیث جو مسند احمد، بزار اور طبرانی میں حضرت علیؓ سے بسندِ صحیح منقول ہوئی ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ حضورؐ کے بعد کون امیر ہوگا۔ آپ نے جواب دیا ان تؤمّروا ابا بکر تجدوہ امیناً زاھداً فی الدنیا راغباً الی الآخرۃ وان تؤمّروا عمر تجدوہ قویاً امیناً لا یخاف فی اللہ لومۃ لائم، وان تؤمّروا علیاً، ولا اراکم فاعلین، تجدوہ ھادیاً مھدیاً یاخذ بکم الطریق المستقیم "اگر تم ابوبکرؓ کو امیر بناؤ گے تو اسے امین، دنیا کے معاملہ میں زاہد اور آخرت کی طرف راغب پاؤ گے۔ اور اگر عمرؓ کو امیر بناؤ گے تو اسے طاقت ور، امین، اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہ کرنے والا پاؤ گے۔ اور اگر علی کو امیر بناؤ گے، اور میں نہیں سمجھتا کہ تم ایسا کرو گے، تو اسے ہادی و مہدی پاؤ گے جو تم کو سیدھے راستے پر چلائے گا۔" (مسند احمد، حدیث نمبر ۸۵۹)۔

اسی مسند احمد میں ۲۶ صحیح سندوں سے یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک تقریر میں برسرِ منبر صاف صاف فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کے بہترین آدمی ابوبکرؓ ہیں اور ان کے بعد عمرؓ۔ یہ روایات ان متعدد اصحاب سے مروی ہیں جو اس تقریر کے موقع پر موجود تھے۔ ان روایات میں سے